علامہ اقبال — بحضور آدم

(۱)

چند سال ہوئے راقم الحروف نے ایک مبسوط مقالہ سپرد قلم کیا جس کا عنوان تھا ''ابو المعانی مرزا عبدالقادر بیدل —مدرس خودی'' — اس مقالے کا اختتام حضرت بیدل کے شعر ذیل پر ہوا تھا :

بحسن خویش نگاہے کہ در جہان ظہور
خطاب احسنِ تقویم داری از خلّاق[۱]

ایک نظر اپنے جمال پر بھی ڈال۔ اس جہان میں جہان بے شمار جلوے بےنقاب ہیں ، خدا نے تجھی کو احسن تقویم کے خطاب سے نوازا ہے — اشارہ تھا اس آیۂ کریمہ کی جانب ''لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم''[۲] — ہم نے انسان کو بہترین اندازے ، بہترین سانچے ، بہترین قوام و عناصر ، بہترین توازن اور بہترین تناسب کے ساتھ خلق کیا -

مرزا عبدالقادر بیدل دیگر اہل نظر انسان دوست درد مندوں کی طرح آدم کی نا خود شناسی کے شاکی تھے یہ موضوع حضرت علامہ اقبال کی شاعری اور نظامِ فکر میں نمایاں ترین موضوع کے طور پر طالبِ توجہ ہے ، جیسا کہ وہ ''اسرار خودی'' کے آغاز میں لکھتے ہیں :

بہر انسان چشم من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست[۳]

آئندہ صفحات میں اسی موضوع کے پرت کھولنے ، آدم کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرنے اور پھر کون و مکاں میں اس کی اصل حیثیت کو بحال کرنے

کی بحوالہ اقبال کوشش کی گئی ہے - ہم اسے مجملاً جمالیات آدم کا مضمون قرار دے سکتے ہیں :

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار[۴]

کون نہیں جانتا کہ حضرت علامہ نے بھی عام اردو شاعر کی طرح شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا - یہ نہیں کہ حضرت علامہ نے نظمیں نہیں کہیں، تاہم آغاز کار میں توجہ کا مرکز عموماً غزل ہی رہی - حضرت علامہ بھی دیگر شعرا کی طرح ایک مدت تک مقبول عام مضامین قلمبند کرتے رہے - مراد ہے کہ وہ بھی غزل کی مروج ہر دلعزیز روش پر گامزن رہے - یہی سبب ہے کہ داغ دہلوی کو اپنے لیے موزوں استاد جانا - ظاہر ہے کہ اگر آن کو اس دور میں حضرت داغ کا انداز غزل گوئی پسند نہ ہوتا تو وہ اُن کی خدمت میں اپنی غزلیں برائے اصلاح نہ بھیجا کرتے - یہ مسئلہ جدا ہے کہ یہ مراسلاتی تلمذ بھی زیادہ مدت جاری نہ رہا - مگر یہ امر بہرحال عیاں ہے کہ حضرت علامہ نے استاد داغ دہلوی سے فقط اصلاح ہی نہ لی بلکہ ان کے طرز بیان سے متأثر بھی ہوئے - چنانچہ اس طرز میں بہت سی غزلیں قلمبند کیں - نظموں کا لب و لہجہ مختلف رہا - پھر جب ذرا خود آگاہ ہوئے تو غزل کی تقلیدی روش ترک کر کے الگ ہو رہے ، حتیٰ کہ جب بانگ درا کی ترتیب کے وقت اپنا اردو کلام منتخب کرنا شروع کیا تو 'داغی' غزلیں طاقِ متروکات کی زینت بن کر رہ گئیں - "باقیات اقبال" مرتبہ عبدالواحد معینی میں ایسی کئی غزلیں آرام فرما ہیں اور یاد دلاتی ہیں بقول اقبال "مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے" -

حضرت علامہ نے جس دور میں داغ دہلوی کو استاد پکڑا ، اس دور میں مولانا الطاف حسین حالی اور اکبر الہ آبادی ابھی زندہ و سلامت تھے - ان دونوں کی شاعری کا بھی چرچا تھا مگر جس طرح کے مشاعر ربا اور سقف شگاف مضامین داغ اور ان کے شاگردان گرامی باندھ رہے تھے ، ان کے مقابل اکبر و حالی وا ماندگانِ راہ دکھائی دیتے تھے - قدرتی امر ہے کہ جوان امنگوں اور پر شباب جذبوں والے اس دور کے اقبال کو اکبر اور حالی جچتے بھی کیوں - یہ بات اپنی جگہ درست کہ آگے چل کے انھوں نے اپنی "ہر لحظہ نیا طور ، نئی برق تجلی" کی خواہاں طبیعت کے باعث اسلوب بیان بھی بدل لیا اور مضامین بھی - یعنی وہ غزلیہ شاعری ترک کر دی جس

کا محور زلف و رخسار ، شراب و شاہد ، قاصد و دربان اور ہجر و وصال کی نقشہ کشی تھا ۔ پھر جب شاعری کا محور بدل گیا تو محاورہ بھی بدل گیا اور ہوتے ہوتے آخر وہ وقت بھی آیا جب حضرت علامہ پکار اٹھے کہ ان کو اُن معروف معانی میں شاعر گمان ہی نہ کیا جائے جن کی رو سے ہوائے مقبولیت کے رخ چلنے والے اہل ہوا شعراء کرام متصور ہوئے ہیں :

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعران افسانہ بستم

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست

بکوئے دلبران کارے ندارم
دلِ زارے غمِ یارے ندارم

بہ جبریلِ امین ہمداستانم
رقیب و قاصد و دربان ندانم

مگر ہر دلعزیزی کی ہوائے خود نمائی سے پنجہ چھڑانا اور ایک بیگانہ روش اختیار کرنا ، یہی نہیں ، اس روش کی طرف دوسروں کو بلانا کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا ۔ اس فیصلے کی عزیمت قلبی سے غیر شاعر حضرات بخوبی آگاہ نہیں ہو سکتے ۔ اس کا اندازہ فضائے مقبولیت میں بلند پرواز اور شہرت شکار شعرائے محترم ہی لگا سکتے ہیں ۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ شعرا کی مشارالیہ پسندیدہ اور عام طرز فکر اور نہجِ فصاحت فقط اس دور کے برعظیم پاک و ہند ہی میں غالب و قاہر نہ تھی بلکہ انگلستان کے شعرا کا بھی تقریباً یہی عالم تھا ۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس ضمن میں ہربرٹ ریڈ کا حوالہ دیا ہے ۔ ہربرٹ ریڈ نے "اسرار خودی" کے باب میں اظہار رائے کرتے ہوئے کہا :

"ادب کے فنکارانہ اظہار کا نقطۂ عروج اور ثمر اور انسانی روح سے وابستہ مسرت کی آخری حد مابعد الطبیعات میں ہے ۔ اس میں روحانی دنیا کے اسرار و رموز بھی نمایاں ہیں ۔ اس میں انسانی روح اور ہمارے تشخص کی لافانی عمل پذیری کا مسئلہ بھی شامل ہے ۔ یہ عہد میں انسانی

ذہن کی اس سے پرداخت ہوتی ہے اور زمان و مکان سے ماورا ہو کر مساوی ہو جاتے ہیں "۔[۶]

ذرا آگے چل کر ہربرٹ ریڈ نے والٹ وھٹمین کی شاعری کے انسانی و آفاقی عناصر پر بحث کرتے ہوئے وضاحت کی ہے :

"ان توضیحات کی شرائط کی بجا آوری کے باوجود وھٹمین کا یہ تصور ادب کی عمل پذیری اور اس کے بلا واسطہ استعمال کا ایک ارفع تصور ہے - اس تصور کے معیار پر اگر آج کے اپنے شعرا کی پرکھ کی جائے تو مجھے صرف ایک ہی ایسا زندہ شاعر نظر آتا ہے جو کم عیار ثابت نہ ہوگا اور یہ بھی طے ہے کہ وہ ہمارے عقیدے اور نسل کا شاعر بھی نہیں - میری مراد محمد اقبال سے ہے جس کی مثنوی اسرار خودی ، کا حال ہی میں فارسی سے ڈاکٹر رینالڈ نکلسن نے ترجمہ کیا ہے اور جسے میسرز میکملن نے طبع کیا ہے آج جب کہ ہمارے مقامی متشاعر اپنے بے تکلف احباب میں بیٹھے کیٹس کے تتبّع میں کتے بلیوں اور ایسے ہی گھریلو موضات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ایسے میں لاہور میں ایک ایسی نظم تخلیق کی گئی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں طوفان برپا کر دیا ہے اور ان میں سے ایک کے بقول اقبال ہمارے لیے مسیحا بن کر آیا ہے اور اس نے مردوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے"۔[۷]

جیسا کہ سطور آغاز میں بیان ہوا، علامہ اقبال نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی قلمبند کیں ۔ حق یہ ہے کہ اکثر نظموں پر تفکر و تفلسف کا وہ سماں چھایا ہوا ہے جو ابتدائی غزلوں میں نسبتاً بہت کم نظر آتا ہے - اولاد آدم کے شب و روز اور ان کی کشمکش کے مضامین حضرت علامہ کی ان نظموں میں بھی جلوہ فرما ہیں جو انھوں نے انگلستان جانے سے قبل تحریر کیں، مثال کے طور پر "انسان اور بزم قدرت" جس میں بتایا گیا ہے کہ تخلیق کائنات کا مقصود ظہور آدم ہے - چنانچہ صبح ، آدم کے ایک سوال کے جواب میں کہتی ہے :

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے سامان وجود[۸]

اسی حصہ اول میں ایک اور نظم ہے جو اس موضوع کی نسبت سے بہت

اہم ہے ، عنوان ہے "سر گزشتِ آدم" ۔ یہ نظم اس قابل ہے کہ سر تا سر درج کر دی جائے ۔

کوئی سنے مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیانِ اولین میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
گیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر ، چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربّانی !
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے

بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلاف معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دوربیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو ، برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے؟

تاریخ کا مطالعہ ، گوئی مشاہدہ اور دینی ارشادات سب درست ، مگر ہم نے دیکھا کہ اس نظم میں بھی جو حضرت علامہ کی شاعری کے دور آغاز کی نظم ہے "راز ہستی" جو اس کے بس کی بات نہ تھی ، راز ہستی کو خانۂ دل ہی میں مکیں قرار دیا گیا ۔

حضرت علامہ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر یورپ تشریف لے گئے ۔ انھوں نے کتابوں کے ساتھ ساتھ اس اہل کتاب معاشرے کا تقلیدی اور گرفتار نظر سے نہیں بلکہ تنقیدی اور ہشیار و بیدار نظر سے مطالعہ کیا ۔ یورپ کے دوران قیام میں ان کی طبیعت ایک اندرونی انقلاب سے دوچار ہوئی جس کا ذکر انھوں نے ایک سے زیادہ بار وحید احمد مدیر "نقیب" بدایوں کے نام تحریر کردہ خطوط میں کیا ہے ۔ مثلاً ایک خط میں جو ستمبر ۱۹۲۱ء کا مورخہ ہے اور "انوار اقبال" میں شامل ہے ، یوں کہتے ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا ، یہ ایک طویل داستان ہے کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلمبند کروں گا جس سے مجھے یقین (ہے کہ) بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا ۔"[۱۰]

یہ الگ بات ہے کہ جس طرح ان کے اور کئی قلمی منصوبے پیرایۂ عمل اختیار نہ کر سکے ، اسی طرح قلب کی سرگزشت قلمبند کرنے کا منصوبہ بھی منجملۂ حسرات ہی رہا ۔ ورنہ یورپ سے لوٹنے کے بعد کی شاعری میں جو اچانک تبدیلی کی لہر اٹھی، اور ایسی اٹھی کہ تادم آخر اس کا زور اور جوش کم نہ ہوا ، اگر اس کا روحانی اور قلبی پس منظر سامنے آ جاتا تو کلام اقبال کے مطالب سے لطف اندوزی اور ایقان پذیری کے مواقع مزید بڑھ جاتے ۔

ہمارے نزدیک اس انقلاب کی آمد آمد کا واضح ترین اعلان وہ اردو غزل تھی جس کے اوپر اس کی تصنیف کا سال بھی درج ہے اور مہینہ بھی ، یعنی مارچ ۱۹۰۶ء ۔ اردو غزلوں میں بلکہ نظموں میں بھی شاید یہ واحد تحریر ہے جس پر اس اہتمام کے ساتھ ماہ و سال تخلیق مرقوم ہے اور یہ وہی غزل ہے جس میں حضرت علامہ نے ایک طرف یورپ والوں کو متنبہ کیا تھا کہ ان کی تہذیب جلد ہی خود اپنے خنجر سے خود کشی کرنے والی تھی اور دوسری طرف اہل اسلام کو خوش خبری سے نوازا تھا کہ جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا ، وہ استوار ہونے کو تھا ۔[۱۱]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض یورپ کے معاشرے میں جا بسنے ہی کے باعث حضرت علامہ کے مزاج میں ایک انقلاب رونما ہو گیا تھا تو درست نہ ہوگا، برعظیم بلکہ دنیائے اسلام سے جا کے انگلستان یا یورپ کے دوسرے ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کی خاطر قیام اختیار کرنے والے ہزاروں مسلمان اور بھی تھے ۔ سب کا رد عمل حضرت علامہ جیسا ہرگز نہ تھا ۔ اصل میں پائدار اندرونی امنگوں اور بیرونی ماحول کی ناسازگاری کے مابین تصادم کی کیفیت وہ تناؤ اور کھنچاؤ (tension) کی سی صورت پیدا کرتی ہے جو کسی فکری ، علمی ، فنی اور شعری تحریک اور تجربے کا روپ دھار لیتی ہے ۔ باہر کا ماحول تو حضرت علامہ کے معاصرین کے لیے تقریباً ایک جیسا تھا ، لیکن اندر کی دنیا مختلف تھی— اور وہ دنیا حضرت علامہ کے ایمان و عقائد کی دنیا تھی ۔ اس اندر کی دنیا میں مسلمان کا غلام ہونا ممکن ہی نہ تھا :

بندۂ آزاد را آید گران
زیستن اندر جہانِ دیگران[۱۲]

مگر حضرت علامہ نے دیکھا تو یہ کہ تقریباً سارا عالم اسلام یورپ والوں کا غلام تھا ۔ حضرت علامہ کے اندر کی دنیا میں بنو آدم کے ہر فرد کو اس کی ماں نے آزاد جنا تھا ، ہر فرد خلافت ارضی کا بالقوّہ مستحق تھا ۔ مگر مادہ پرست معاشروں میں انسان مادی پیاس بڑھانے والے مختلف پیشوں اور رنگا رنگ مشینوں کا ادنیٰ پرزہ بن کر رہ گیا تھا ۔ ایک طرف آدم کی فطری شان اور اس کا استحقاق تھا جو حضرت علامہ کے کونی مشاہدے کا ایک غیر متزلزل زاویہ نظر تھا ۔ دوسری طرف بنو آدم کی بنو آدم کے ہاتھوں رسوائی اور بربادی کا نظر تھا ۔ ایسی فکری اور نظری اوگھٹ گھاٹیاں حضرت علامہ کی راہ حیات میں قدم قدم پر حائل تھیں جن کو سر کرنے کی حضرت علامہ نے شعوری کوشش کی اور جب ایک بار اس کوشش کا آغاز ہو گیا تو پھر ان کے دمِ آخر تک یہ کوشش آغاز ہی کے ولولے کے ساتھ جاری رہی اور بے محل نہ ہوگا اس امر کا تذکرہ کہ ارمغان حجاز (جو حضرت علامہ کی آخری کتاب ہے اور ان کی وفات کے بعد طبع ہوئی) کا آخری حصہ جس عنوانِ خیر الختام کا حاصل ہے وہ ہے "بحضور آدم"۔

ہاں تو حضرت علامہ نے اس اندرونی انقلاب کی طرف "دوسری گول میز کانفرنس" کے زمانے میں بھی اشارہ کیا یعنی ۱۹۳۱ء کے اواخر میں ۔ ہوا یوں کہ کیمبرج یونیورسٹی کے حلقہ کی یونین نے انھیں چائے پر مدعو کیا ۔ وہاں حضرت علامہ نے اپنی گفتگو کے دوران نوجوانوں کو نصیحت کی کہ وہ دہریت اور مادیت سے محفوظ رہیں ۔ انھوں نے اپنے اس بیان کی وضاحت کے طور پر فرمایا کہ اہلِ یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مذہب و حکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا، اس طرح ان کی تہذیب ، اخلاق سے محروم ہوگئی اور اس کا رخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا ۔ اس موقع پر انھوں نے ۱۹۰۷ء میں اپنے قلب و روح کے تہلکانوں کو اضطراب آشنا کرنے والی کیفیت کا بھی ذکر کیا :

"میں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی یہ خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق پیش گوئیاں کی تھیں ، میری زبان پر وہ پیشگوئیاں جاری ہوئیں ، اگرچہ میں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا ۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے ۔ اس سے چھ سات سال بعد ۱۹۱۴ء میں میری یہ پیشگوئیاں حرف بہ حرف پوری ہوگئیں ۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ یورپ دراصل اہلِ یورپ کی اس غلطی کا نتیجہ تھی جس کا ذکر پہلے

کر چکا ہوں یعنی مذہب و حکومت کی علیحدگی اور دہریانہ مادیت کا ظہور - بالشوزم مذہب و حکومت کی علیحدگی کا ایک طبعی نتیجہ ہے - میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مادیت سے بچیں - چند روز قبل انگریز خواتین کے ایک بہت بڑے مجمعے میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں عورتوں کو کوئی نصیحت کروں - میں نے انہیں کہا تھا کہ انگریز خواتین کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ آئندہ نسل کو دہریانہ مادیت کے چنگل سے محفوظ رکھیں - مذہب بے حد ضروری چیز ہے - یہ مذہب عرفان و ایقان کا نام ہے -"[۱۳]

واضح ہے کہ یہ ہمدردانہ نصیحت پارے جن مرد و زن کی خدمت میں پیش کیے جا رہے تھے ان کی اکثریت کثیرہ غیر مسلموں پر مبنی تھی - مراد یہ کہ حضرت علامہ کا مسئلہ ، عقدہ اور معما پوری اولاد آدم سے متعلق تھا - یہ الگ بات ہے کہ وہ اولاد آدم بشمول امت مسلمہ کے مسائل و مصائب کا حل ان سنہری اصولوں میں مہیا پاتے تھے جن کا معروف عنوان اسلام ہے - جیسا کہ آگے چل کے بیان ہوگا ، انشاء اللہ -

بہرحال بات ہو رہی تھی حضرت علامہ کے قیام یورپ کے بارے میں، تو جس زمانے میں حضرت علامہ یورپ میں مقیم تھے وہ اس زمانے کے ادبیات مشرق و مغرب کے متن و مواد سے مطمئن نہ تھے - ان کے نزدیک مغرب کے ادب میں پھر کچھ جان تھی - یہ الگ بات ہے کہ ہم مغربی ادب کے شعبۂ شاعری کی ذیل میں ہربرٹ ریڈ کی رائے سے آگاہ ہو چکے ہیں - مگر ظاہر ہے کہ ہربرٹ ریڈ اس دور کی مشرقی ادبیات خصوصاً شاعری کے کوائف سے یقیناً نا آگاہ تھا ، حضرت علامہ کی نظر میں مشرقی ادب گویا مغربی ادب کے مقابل زیادہ بے جان تھا - اس بات میں حضرت علامہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

"۱۹۰۵ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دلکشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لیے اُمید ، ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے - یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی ، وہ اگرچہ ہمت افروز نظر آئیں لیکن ان کے مقابل میں سائنس کھڑی تھی جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی اور ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس گیا تو میرے نزدیک یوروپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی جو مشرقی ادبیات کی تھی ، ان

حالات میں میرے دل میں کشمکش شروع ہوئی کہ ان ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں روح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایہ حیات فراہم کرنا چاہیے - میں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور میں اس میں اس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں — ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں - لیکن اندیشہ تھا کہ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی - بہرحال میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدنظر رکھ کر اپنی مثنوی اسرار خودی لکھنی شروع کی -"

مثنوی اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی - اس مثنوی میں بنو آدم کو ان کے مقام سے آگاہ کرنے کی کوشش عمل میں آئی اور عیاں ہے کہ یہ کوشش امت مسلمہ کے ایک فرد کی جانب سے عمل میں آئی - اس میں کوئی اعجوبہ نہیں ، تضاد نہیں ، اس لیے کہ حضرت علامہ کی نظر میں دین اسلام کسی خاص علاقائی اور لسانی و لونی یا نسلی معاشرے کے لیے نہ تھا ، دین اسلام چند موٹے موٹے بنیادی اصولوں کا نام ہے جن کو ہر رنگ کے معاشرے کا ہر فرد قبول کرکے ایک بین الاقوامی اور بین الانسانی اخوت روحانی میں شامل ہو سکتا ہے - چنانچہ حضرت علامہ کا پیغام یا فریاد یا للکار ساری اولاد آدم کی صلاح و فلاح کے لیے ہے اور اسلام ہی کے روشن اصولوں پر یہ پیغام ، فریاد یا للکار ہر مبنی ہے ، حضرت علامہ نے "اسرار خودی" کے ابتدائی صفحات ہی میں اس حقیقت کا خود اظہار کر دیا تھا :

بود نقشِ ہستیم انگارۂ
نا قبولے ناکسے ناکارۂ

عشق سوہان زد مرا آدم شدم
عالمِ کیف و کمِ عالم شدم

بہرِ آدم چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرار زیست

از درونِ کارگاہِ ممکنات
بر کشیدم سرِ تقویمِ حیات

من کہ این شب را چو مہ آراستم
خاک پائے ملتِ بیضا شدم[۱۰]

"میری ہستی ایک نقش نا تمام تھی - نامقبول، بے کار، بے تشخص، یقین و اخلاص کی برکت سے میں آدم بن گیا اور اس طرح دنیا و جہاں کے کوائف و احوال سے آگاہ ہوا، میں نے نوع انسانی کے لیے روتے راتیں بسر کر دیں اور پھر ایک مرحلہ آ گیا کہ میں نے زندگی کے پردۂ اسرار کو چاک کر ڈالا، میں نے اس کارگاہ عالم میں جہاں امکانات حقائق ہیں تشکیل پاتے رہتے ہیں زندگی کی تقویم یعنی قوت و توازن اور بقا کے بھید ڈھونڈ نکالے، میں کہ جس نے رات کو چاند کے انداز میں سنوارا ہے ملت اسلامیہ کی خاک پا ہوں - مراد ہے ایک ادنیٰ سا فرد مسلم ہوں -"

حضرت علامہ پر ان کی زندگی میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی ایک اعتراض یہ وارد کیا جاتا رہا ہے کہ وہ فقط امت مسلمہ کو اپنا مخاطب جانتے ہیں ، کوئی ایسا ہی اعتراض تھا جس کے جواب میں حضرت علامہ نے ۱۴ نومبر ۱۹۲۳ء کے مورخہ ایک خط میں بطور وضاحت فرمایا :

"دوسرے اعتراض کے متعلق یہ بھی عرض ہے کہ میرے نزدیک اسلام نوع انسانی کی اقوام کو جغرافی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل اور قومیت کے مصنوعی مگر ارتقائے انسانی کے ابتدائی مراحل میں مفید امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔ اسی لیے اسلام اور مذاہب (بدھ ازم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا۔ چونکہ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لیے یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے اس واسطے بنی نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیش نہاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے - یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں - ابتدا میں میں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستانی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا - لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی پیدا کر دی — آپ Pan-Islam کو ایک پولیٹیکل یا قومی تحریک تصور کرتے ہیں - میرے نزدیک یہ ایک طریق چند اقوام انسانی کو جمع کرنے اور

ان کو ایک مرکز پر لانے کا ہے ۔ اس غرض سے ایک مرکز شہودی پر مجتمع ہونے اور ایک ہی قسم کے خیالات رکھنے اور سوچنے کے باعث یہ اقوام نسلی اور قومی اور ملکی امتیازات و تعصبات کی لعنت سے آزاد ہو جائیں گی ، پس اسلام ایک قدم ہے نوع انسانی کے اتحاد کی طرف ، یہ ایک سوشل نظام ہے جو حریت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے ۔ اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اقوام انسانی کے لیے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے اور جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ خالصتاً للہ اپنی زندگی میں ایک عملی انقلاب پیدا کرے اور اگر دماغی قوت رکھتا ہے تو اپنی بساط کے مطابق اسلام کے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے تاکہ نوع انسانی قدیم توقعات سے نجات پائے ۔ "[۱۶]

"برکشیدم سرتقویم حیات" سے حضرت علامہ نے ایک فرد مسلم کے بطور "بحالیات آدم" کے امر مہم میں خوب خوب کام لیا ، آدم کی کونسی حیثیت اس کی شان کے شایان ہے ، یہ مسئلہ حضرت علامہ کے چند اہم مسائل میں سے ایک ہے ۔"تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کا آغاز ہی اس امر مہم کی یاد دہانی سے ہوتا ہے :

> "یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے اور ترکیب کیا ہے کیا اس کی ساخت میں کوئی دوامی عنصر موجود ہے ۔ ہمیں اس سے کیا تعلق ہے اور ہمارا اس میں کیا مقام ہے ۔ باعتبار اس مقام کے ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے ۔ "[۱۷]

ہمارا اس عالم سے کیا تعلق ہے ، ہمارا اس میں کیا مقام ہے اور باعتبار اس مقام کے ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے ۔ اس "چاہیے" سے صاف ظاہر ہے کہ افراد اولاد آدم از روئے "ذات یا شخصیت بنے بنائے کاملاً مشخص اور شخصاً کامل تشریف نہیں لائے ۔ انھیں اپنے ممکنات کو خود اپنے عزم و ارادہ اور محنت و مشقت سے بروئے کار لانا ہوتا ہے ۔ افراد آدم اس عالم میں جس درجے اور مقام کے بالقوہ مالک ہیں اس درجے اور مقام تک پہنچنے کے لیے اس مقام اور درجے سے کمتر کئی درجات و مقامات چھوڑنا پڑتے ہیں ۔ شخصیت کا ارادی ارتقاء ہر عبور شدہ مرحلے سے قبل کے عناصر کو جو اس وقت درکار

تھے مگر بعداً زائد اور غیر ضروری ہوگئے چھانٹ دیتا ہے ۔ گویا شخصیت اس طرح پروان چڑھتی ہے کہ زوائد رحلت یاب اور مطلوب مرحلہ بہ مرحلہ مکسوب ۔ بقول حضرت علامہ :

"We become by ceasing to be what we are. Life is a passage through a series of deaths." [18]

آدمی کے وجود میں لاکھوں خلیے روز وجود میں آتے ہیں اور لاکھوں خلیے روز مرتے ہیں ۔ ہر لحظہ ایک انقلاب اور ہلچل ، مگر خود آدمی کو خبر نہیں ہوتی کہ اس کے اندر کیا قیامتیں بپا ہیں ، تاہم یہ جسم کی بات ہے جو ایک مرکزی ملموس وجود رکھتا ہے ۔ اور واضح ہے کہ فرد آدم فقط جسم ہی نہیں ۔ اس کا دوسرا پہلو عقلی ، شوقی ، ذوقی ، ذہنی ، فکری ، جذبی اور حیوانی ہے ۔ وہاں بھی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے ۔ کئی عقیدے کہ جان کی طرح عزیز محسوس ہوتے ہیں بمرور وقت غیر محسوس طور پر اہمیت گنوانے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں ۔کتنی جذباتی اور انسی لگاوٹیں ہوتی ہیں جو نذر احوال ہو کر رحلت فرما جاتی ہیں ۔ کتنی تمنائیں ایسی محبوب ہوتی ہیں کہ ہر تمنا پہ دم نکلے مگر پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ تمنائیں صرف غیر محبوب ہو کر ہی نہیں رہ جاتیں بلکہ مضحکہ خیز نظر آنے لگتی ہیں، حتیٰ کہ ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ وہ تمنائیں بر آ جاتیں تو اپنا پٹڑا ہوگیا ہوتا اور کبھی کبھی اپنی دعاؤں پر ہنسی بھی آتی ہے کہ سبحان اللہ ہم کس کس شوق کی تکمیل میں راتوں کو رو رو کر اللہ کے حضور مناجاتیں عرض کرتے تھے ۔ غرض کئی اعتادات مشکوک ہوکر ناپید ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے اعتقادات وارد ہونے لگتے ہیں ۔ خانۂ وجود وجوداً ایک ہی تھا لیکن کن کن انقلابات سے دو چار ہوتا رہا ، مگر بہرحال منزل بہ منزل بڑھتا رہا ۔ کیا کیا جھڑتا رہا اور کیا کیا کچھ آگے شامل ہوتا رہا :

' Life is a passage through a series of deaths."

اور پھر ظاہر ہے کہ فردِ خود آگاہ کا شعورِ مسئولیت اس کے فکری وجذبی وجود میں شعوری تبدیلیاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے ، یوں اس کا تعقل ، ضمیر اور وجدان بزبان اقبال اس کو یہ پیغام سناتا ہے :

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
میری دعا ہے تری آرزو بدل جائے[۱۸]

آرزو بدل جائے ؟ مراد ہے آرزو بہتر سے بہتر ہوتی چلی جائے لیکن معاشرے میں وہ افراد کتنے مفید پائے جاتے ہیں جو واقعی اچھے اور برے میں تمیز کرنے پر قادر ہوتے ہیں اور بالخصوص وہ کتنے ہوتے ہیں جو عزم و ارادہ سے کام لے کر غلط جذبہ و کشش کا جواب ثبات و دفاع کی صورت میں دیتے ہیں - یہ عیاں ہے کہ غالب اکثریت نیک و بد سب تمیز روا رکھنے کی اہل ہونے کے باوصف اپنے روحانی پہلو کا اپنے حیوانی پہلو کے حضور میں سر تسلیم خم کر دیتی ہے اور کیے رکھتی ہے - روحانی پہلو شعوراً جبلی ، مادی اور ہوسی تقاضا کی بے لگامی کو روکتا ہے اور راہ توازن و اعتدال دکھاتا ہے - اور بالعکس پھر جس نے جبلی، مادی اور ہوسی تقاضا کی بے لگامی کے مقابل ہتھیار ڈال دیئے وہ نیچے کی طرف کھسکتا اور پھسلتا چلا گیا Canon Peler Green نے اس صورت حال پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :

"But since actions affect character, a man who steadily selects the best and noblest of many competing courses will develop in time a nobler character while the man who selects always the low and base course out of several alterantive ones will develop a base character. And this agrees with our daily experience. So to the man who seeks to excuse his faults by saying "If God made me, He, not I, is responsible for my faults, "we may truly, reply, "But God did no make you. He placed in your hands the power to make yourself. This doctrine that man is in truth a self-creating being is of the greatest possible importance alike in life and in ethical theory."[20]

مراد یہ کہ آدمی خود پرواز اور خود اختیار ہے ، چاہے تو ایسا رویہ اختیار کرے جو اسے بلندیوں کی طرف لے جائے اور چاہے تو وہ رویہ اختیار کرے جو اسے پستیوں کی طرف دھکیل دے، آدمی میں یہ اختیار استعمال کرنے کی اہلیت موجود ہے ، اس میں فرمان پذیری کی قابلیت بھی موجود ہے اور نافرمانی کی بھی، مگر آغاز کار میں اس کی خلقت پر مادی عنصر غالب رہتا ہے۔[21] رفتہ رفتہ روحانی پہلو بیدار ہونے لگتا ہے اور تعقل کا جوہر اپنے کام میں لگ جاتا ہے ، صوفیاء نے وجود مادی کو عالم خلق قرار دیا ہے اور روحانی پہلو کو عالم امر ، پھر شعور و تعقل کی بلوغت سے متناسب عالم خلق اور عالم امر

کے مابین کشمکش شروع ہو جاتی ہے ، اب ہر وہ فرد جس نے عزم و ارادہ کے ساتھ عالم امر کو عالم خلق پر حاوی کر لیا وہ اصل فطرت آدمیت کی طرف لوٹنے اور اسے پا لینے کے قابل ہو گیا ۔ اس کے برعکس جس نے اپنے روحانی پہلو کو غفلت کی نذر کر دیا وہ عالم خلق یعنی مادی حیوانی پہلو کا اسیر و بندہ ہو کر رہ گیا اور اس کا سفر ہستی کی جانب جاری رہا اور آخر ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ روحانی اور حیوانی پہلو کے مابین کشمکش ختم ہو گئی اور حیوانی پہلو پوری طرح قابض ہوگیا ۔ لٰہذا آدمی بڑی بے نیازی کے ساتھ جسم ہی کے جبلی احکام پورے کرنے میں لذت محسوس کرتا رہا ۔ ایسے ہر آدمی کے لیے یہ مسئلہ ہی نہیں رہ جاتا کہ وہ آدمی ہے اور آدمی کی حیثیت سے اسے کون و مکان میں کوئی مقام حاصل ہے اور اسے اپنے آپ کو اس مقام کا اہل ثابت کرنا ہے ۔

حضرت علامہ کا مشہور قطعہ ہے :

دلے چون صحبتِ گل می پذیرد
ہمان دم لذتِ خوابش بگیرد

شود بیدار چون من آفریند
چو من محکومِ تن گردد بمیرد[۲۲]

جوہر آدمیت سے محروم فرد ضروری نہیں کہ جنگلی ، بدوی ، ناخواندہ اور آداب سے نا آگاہ ہو ، وہ بڑا بارعب مہذب بھی نظر آ سکتا ہے وہ عالم و فاضل بھی ہو سکتا ہے ۔ وہ استاد ، وکیل ، معالج ، صنعت کار ، خلا باز سائنسدان اور اعلیٰ درجے کا کماندار و حکمران بھی ہو سکتا ہے ، وہ چوٹی کا واعظ اور ذاکر بھی ہو سکتا ہے—— وہ اپنے خاص شعبے میں بڑا نامی گرامی اخباری اور اشتہاری بھی ہو سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اسے یہ بھی خیال ہو یا یاد رہے کہ اسے اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سب کچھ سے بڑھ کر آدمی بھی بننا اور رہنا ہے ۔ اس کی تعلیم میں تعلیم آدمیت اور تربیت انسانیت قسم کی کوئی شے شامل ہی نہیں برایفالٹ کے بقول :

It is reasonable and right that every man should with all available knowledge and training be fitted for the paritcular work he is intended to perform but that is not

the first object of education. It is not in the proper sense education at all. The carpenter should be trained in carpentering, the doctor in medical science, the farmer in agriculture. But a man besides being a carpenter, a doctor or a farmer is first and foremost a man. In addition to carpentering or doctoring or farming, in addition to having to deal with the problems of materials and construction, or pathology or of the chemistry of soil he is confronted with the problems of the living world. In addition to being a working member in the division of the world's labour he is a living mind."[22]

آدمی بہت کچھ جاننا چاہتا ، بہت کچھ بننا چاہتا ہے مگر اپنی اساسی حیثیت کی شناخت کا اسے کبھی خیال نہیں آتا ، وہ کیا جوہر ہے جس کی بدولت وہ سچ مچ مقام آدمیت پر فائز ہو سکتا ہے ، وہ اس علم سے محروم ہے ، مادی دولت کے درجات ، فنی درجات ، منصبی درجات ، سیاسی درجات اپنی جگہ بجا ، آدمی ہر باب میں بظاہر کامیاب ۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ پہلو اس کے سامنے نہیں آتا جو آدم کو ان جملہ درجات سے فائق بنائے ۔ اگر آدمی اپنی شان سے واقف نہیں تو پھر وہ اپنے مال کا غلام ہے ، اپنی جاہ کا مملوک ہے ، اپنے منصب کا بندہ ہے ، اپنی کرسی کا چپڑاسی ہے ، اپنے فن کا رکابدار ہے اور اپنے علم کا چلم بردار، یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ آرائشی اور تربیتی مگر انفکاک پذیر متعلقات ہیں ۔

آدمی وہ بھولی سرکار ہے کہ اپنے اکتساب کو اللہ کی دین مانے اور جو جب تک میسر ہے ، اسے اپنی ملکیت اور سلطنت جانے ، خود کو حاکم و سلطان اور والی سمجھے، چہ جائیکہ اپنی ملکیت کی مملوکیت میں مبتلا ہو جائے۔ فائق وہ ہے ، متصرف وہ ہے، دنیا جہاں میں جو کچھ ہے اس کے لیے ہے نہ کہ برعکس، حضرت علامہ نے بجا ہی تو فرمایا تھا :

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے[٢٣]

اور اسی نا آگاہی سے آدم کو آگاہ کرنے کی خاطر مزید فرمایا :

اندکے اندر جہانِ دل نگر
تا ز نور شعر می روشن بصر[۲۵]

بینی جہاں را خود را نہ بینی
تا چند نادان غافل نشینی

نورِ قدیمی شب را برافروز
دستِ کلیمی در آستینی

بیرون قدم نہ از دورِ افلاک
تو پیش ازینی تو بیش ازینی[۲۶]

"تو دنیا کا جائزہ تو لیتا ہے مگر خود اپنا مشاہدہ نہیں کرتا ۔ اے نادان تو کب تک غافل رہے گا۔ تو نور قدیم ہے ، نور ازل ہے، تو دنیا کی تاریکیوں کو روشنی میں بدل دے، تو ید بیضا ہے مگر اپنی آستیں میں چھپا ہوا ہے ۔ آفاق حدود سے قدم باہر رکھ، تو ان حدود کا قیدی نہیں ۔ تو ان حدود سے آگے نکل جا ۔ تو جہاں کے وجود میں آنے سے قبل بھی تھا ، تو اس جہان سے گرا نبہاتر ہے اور وسیع تر ہے ۔"

حضرت علامہ نے آدمی کو "نور قدیم" قرار دیا ہے ، مراد ہے کہ ہستی آدم میں نور ازل کا پر تو موجود ہے ، یہ اشارہ ہے ان کلمات خداوندی کی طرف "ونفخت فیہ من روحی ۔"

حضرت علامہ آدمی کی روح کو پارۂ نور جانتے ہیں اور یہی آدم کا مایۂ فضیلت ہے ،کون و مکان کی کسی دوسری مخلوق کے بارے میں خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایہ ۔ خلاق کون و مکاں نے فرشتوں کو حکم دیا :

"فاذا سویتہ ، ونفخت فیہ من روحی فقعولہ ساجدین ۔"[۲۷]

"اور جب میں اسے ٹھیک ڈھال دوں اور اس میں اپنی روح
پھونک دوں تو اس دم تم اس کے لیے سر تسلیم خم کر دینا ۔"

یہاں توجہ طلب کلمہ "روحی" میری روح ، اپنی روح ہے ، یعنی خداوند کریم نے روح کو متکلم کے صیغے کے ساتھ حاضر کر دیا ہے ۔

نفخ روح کے باب میں محمد اسد (لیوپولڈ) اپنی تفسیر میں کہتے ہیں :

God's breathing of His spirit into man is obviously a metaphor for His endowing him with life and consiousness, that is, with a soul.[28]

مگر یہاں بات "a soul" کی نہیں یہاں معاملہ روحی یعنی my soul کا ہے۔درست کہ بیان مجازی ہے مگر نسبت تو خدا کی طرف ہے۔ پیر محمد کرم شاہ اس امر کی وضاحت یوں فرماتے ہیں "اضافت بعضیت کی نہیں بلکہ تشریف اور عزت افزائی کے لیے ہے ۔ اس اضافت کی وجہ یہ ہے کہ تجلیات رحمانیہ کے قبول کرنے کی صلاحیت صرف اس میں پائی جاتی ہے ۔ کیونکہ یہ روح عالم خلق اور عالم امر دونوں کی خصوصیات کی جامع ہے اسی لیے اسے خلافت کا مستحق قرار دیا گیا ۔"[۲۹]

پیر صاحب کے پیش نظر مفہوم یہ ہے کہ خالق دو جہاں نے آدم کی شان اور عزت بڑھانے کے لیے "من روحی" کا پیرایہ بیان اختیار کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود کوئی اپنا حصہ یا ہستی مطلق کا کوئی پارہ آدم میں منتقل کر دیا ہو ۔ تاہم وہ کوئی شے نوری سی ہے ورنہ اس میں تجلیات رحمانیہ کو قبول کرنے کی اہلیت و صلاحیت کہاں سے آئی ۔

پیر غلام وارث مرحوم عموماً حضرت طنطاوی کا اتباع کرتے ہیں ۔ وہ اس نکتے کی تشریح بالفاظ ذیل کرتے ہیں :

"روح کی نسبت اپنی طرف کرنے سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کوئی جزو انسان میں حلول یا شامل کر دیا ہو بلکہ مقصود تمثیل و تحریم ہے یعنی میں نے اس میں ایسی روح (جان) ڈالی ہے جس کو میرے ساتھ خاص نسبت اور قریبی تعلق ہے ۔ اس کو میں نے اپنا مظہر (نائب) بنا کر ، ایک حد تک تصرف و اختیار ، علم اور تخلیقی قوت دی ہے ۔ گویا اس لفظ سے انسان کے شرف کا اظہار کرنا مقصود تھا ۔ (آدم کو) یہ (فرشتوں کا) سجدہ خلافت

الٰہیہ کے نشان کے طور پر تھا ، گویا دنیا کی تمام طاقتیں بنی آدم کی مطیع ہوں گی اور خود انسان اللہ کے آگے سر بہ سجود رہے گا ۔"[۳۰]
حضرت شاہ ولی اللہ روح کی اس لطیف حقیقت کو ایک نورانی نقطہ اور عالم قدس کا ایک روزن قرار دیتے ہیں ۔ حضرت شاہ صاحب ہی کے الفاظ میں "اس کو ابتداءً روح ہوائی سے تعلق ہے اور ثانیاً بدن سے کہ روح ہوائی سے مرکب ہے ۔ وہ عالم قدس کا ایک روزن ہے ، جب روح ہوائی میں قابلیت اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت روح سماوی کا اس پر نزول ہوتا ہے ۔"[۳۱]

حضرت علامہ بھی انسانی جوہر حیات کو نوری نقطہ ہی قرار دیتے ہیں :

نقطۂ نوریے کہ نامِ او خودی است
زیر خاکِ ما شرارِ زندگی است[۳۲]

جوہرِ نوری است اندر خاکِ تو
یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو[۳۳]

بہرحال ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سر تسلیم آدم کے حضور میں خم کر دیا اور ابلیس کو اگر دلیل ملی تو یہ کہ "خلقتنی من نار و خلقتہ من طین" ۔ ابلیس کے اس موقف کو حضرت علامہ بالفاظ ذیل بیان کرتے ہیں :

نوریِ نادان نیم ، سجدہ بآدم کنم
او بہ نہاد است خاک من بہ نژادِ آذرم[۳۴]

عدول حکم اپنی جگہ ، مگر دلیل کا اس امر پر زور کہ آدم خاک سے پیدا ہوا ۔ اس اعتبار سے کمزور تھا کہ ابلیس نفخ روح کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہا ۔ بجا کہ وجود آدم کا ظاہری پیکر خاک سے تشکیل یاب ہوا مگر دوسرا پہلو جو ممکنات و قابلیات کا پہلو تھا اس کی عظمتوں سے ابلیس آگاہ نہ تھا ۔ پروفیسر عبداللہ یوسف علی اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

"The origin of evil is arrogance and jealousy on the part of Satan who saw only the lower side of man (his clay) and failed to see the higher side, the faculty brought in by the spirit of God".[35]

ظاہر ہے کہ وہی وجود جو "احسن تقویم" کا مضمون اور نفخت فیہ من روحی" کی تفسیر تھا صفات الٰہیہ سے پر تو پذیر ہونے کے قابل اور اہل تھا، حضرت علامہ کے الفاظ میں :

"ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدۂ افلاک ہے تو

ترے صید زبون افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاک ہے تو"[۳۶]

اور پھر جس کی اہلیت یہ تھی وہی زمین پر خلیفۂ خداوندی بھی ہو سکتا ہے چنانچہ اسی کے حق میں خلاق کون و مکاں نے "انی جاعل فی الارض خلیفہ" کا اعلان فرمایا تھا ۔ کلمۂ خلیفہ کی وضاحت کرتے ہوئے اور مفسرین سلف کے حوالے سے مولانا عبدالماجد دریا آبادی رقمطراز ہیں :

"خلیفہ اسے کہتے ہیں جو کسی کی نیابت کرے اور خلیفتہ اللہ وہ ہے جو زمین پر اللہ کی شریعت کی حکومت قائم کرے، یخلفی فی الحکم بین خلقی و ذلک الخلیفہ ہو آدم من قامہ مقامہ فی طاعۃ اللہ والحکم بالعدل بین خلقہ (ابن جریر ۔ ابن عباس، ابن مسعود) — خلیفۃ اللہ فی ارضہ لاقامتہ أحکامہ و تنفیذ قضایاہ (معالم) یہیں سے ظاہر ہوگیا کہ انسان کو جو قویٰ ملیں گے وہ اس غایت و مقصود یعنی منصب خلافت الٰہی کے تناسب سے ملیں گے، نسل انسانی خود اپنی اصلاح و فلاح کے لیے اس کی محتاج تھی اور محتاج ہے کہ کسی اپنے ہم جنس کے واسطے سے شریعت الٰہی سے استفادہ کرے اور سلسلۂ نبوت اسی واسطے قائم ہوا، واضح رہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے بھی انسان اور نوع انسان کو اس بلند مرتبہ یعنی خلافت و نیابت الٰہی پر نہیں رکھا ۔"[۳۷]

مگر "انی جاعل فی الارض خلیفہ" کے اعلان خداوندی کو سن کر فرشتوں نے التماس کی تھی کہ ایسے وجود کو لباس ظہور عطا ہو رہا ہے جو دنیا میں خونریزی کا مرتکب ہوگا ۔ ساتھ ہی فرشتوں نے یہ بھی عرض کیا کہ جہاں تک تسبیح و تقدیس کا تعلق ہے ان کا اپنا (فرشتوں کا) وجود کافی تھا ۔ جواب خداوندی تھا "انی أعلم ما لا تعلمون[۳۸]" میں وہ کچھ جانتا ہوں جو کچھ تم

نہیں جانتے ، چنانچہ پہلا مرحلہ اسماء اشیاء ہی کا آ گیا ، اللہ تعالیٰ نے آدم کو جملہ اشیا کے علم سے نواز دیا تھا — پھر فرشتوں کو جلوۂ اشیاء دکھا کر پوچھا ''أنبئونی بأسماء ھؤلآءِ ان کنتم صادقین'' ۔[۳۹]

—اگر تم ٹھیک ہی کہتے ہو تو ذرا ان اشیاء کے اسماء مجھے بتاؤ —

مطلب واضح تھا کہ جس کو دنیا میں میرا نائب بن کر رہنا ہے وہ اس دنیا کو مسخر کرنے کے قابل ہونا چاہیے، اور تسخیر کے لیے لازم ہے کہ جملہ اشیاء کی اصلیت و ماہیت سے آگاہی میسر ہو ۔ بالفاظ علامہ اقبال :

علمِ اسماء اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیا حصارِ آدم است[۴۰]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی تشریحاً لکھتے ہیں :

''یعنی آدم کو اشیاء کائنات کے اسماء و آثار اور خواص کا علم دے دیا'' ۔
علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں :

''الاسم ما یعرف ذات الشیٔ'' ، اسم سے مراد ہے وہ کلمہ جس کے ذریعے کسی شے کی ذات ، حقیقت ، اصلیت اور خاصیت معلوم کی جا سکے ۔ فرشتوں کا جواب تھا :

> ''قالو سبحانک لاعلم لنا الاماعلمتنا انک انت العلیم الحکیمO قال یا آدم انبئھم باسائھم ج فلما انباھم با اسائھم قال آلم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوت و الارض و أعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون''[۴۱]

> ''وہ بولے تو پاک ذات ہے ، ہمیں تو کچھ علم نہیں ہاں مگر وہی جس کا علم تو نے ہمیں عطا کیا ، بیشک تو ہی بڑے علم والا اور حکمت والا ہے — (پھر) کہا اللہ نے آدم کو بتلا دو انھیں ان (چیزوں) کے نام ۔ جب آدم نے اشیا کے نام بتا دیے تو اللہ نے کہا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو میں سب جانتا ہوں ۔''

محولہ بالا آیت کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر علی شریعتی لکھتے ہیں کہ ''خود اللہ آدم کا معلم ہے ، اسی نے آدم کو اسماء اشیاء سکھائے تا کہ وہ

چیزوں کو ان کے نام سے جان سکے ، اسماء اشیاء کی تعلیم گویا پہلی تعلیم تھی - اس طرح آدم کا برتر علم فرشتوں کے مقابل اس میں یکتا فوقیت کا نشان بن گیا - یہ برتری اصلی نسلی نہ تھی[۳۲]۔ اور خواص اشیاء سے آگاہی سے تسخیر فطرت کی راہ کھلتی ہے - مگر یہ بحث آگے چل کے "آدم اور تسخیر فطرت" کے باب میں عرض کی جائے گی - اس ضمن میں مولانا محمود الحسن[۳۳] رائے زنی فرماتے ہیں :

"اس سے علم کی فضلیت عبادت پر ثابت ہوئی - عبادت میں تو فرشتے آدم سے بڑھے ہوئے تھے مگر چونکہ وہ علم میں انسان سے کم تھے، اس لیے مرتبہ خلافت سے محروم رہے ، عبادت خاصہ مخلوق ہے ، خدا کی صفت نہیں علم خدائے تعالیٰ کی صفت اعلیٰ ہے ، اس لیے مستحق خلافت بنو آدم ہوئے کیونکہ ہر خلیفہ میں مستخلف منہ کا کمال ہونا ضروری ہے -"[۳۴]

گویا بندے کے امکانات میں یہ امکان شامل ہے کہ وہ صفات الٰہیہ سے متصف ہونے کے باب میں ترقی پذیر رہے - صفات الٰہیہ کے پرتو کا کائنات میں سب سے بڑا امانت دار وہی ہے - ہر امکان بقدر بار امانت ہے - کیا خلیفہ اللہ ہونے کی اہلیت کا حق امانت ادا ہوا ، کیا آدم امانت داری کی مسئولیت کو سمجھا بھی ؟ حضرت علامہ فرماتے ہیں :

مشو غافل کہ تو او را امینی
چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی[۳۵]

پروفیسر غلام دستگیر رشید نظام کالج حیدر آباد (بھارت) کے الفاظ میں "عبد ہوکر بھی وہ امین اللہ ، خلیفہ اور ولی اللہ ہوتا ہے ، ایسا عبد کہہ سکتا ہے ، انا عبدک ، کیونکہ وہ معلوم اللہ ، مخلوق اللہ اور غیر ذات اللہ ہے اور پھر وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے - فمن رآنی فقد رأ الحق کیونکہ اس میں آیت حق ہی کی ہے - اسی خیال کو اقبال وضاحت کے ساتھ یوں ادا کرتے ہیں :

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیر نقابی

تلاش او کنی جز خود نیابی
تلاش خود کنی جز او نیابی ![۳۶]

گویا عبد ہے معیاری اور نصب العینی بندہ ۔ اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا۔ ارشاد خداوندی ہے :

"صبغة الله و من أحسن من الله صبغة ۔"[۳۶]

"اللہ کا رنگ اختیار کرو ، اللہ کے رنگ سے بہتر اور خوشتر رنگ کس کا ہے" ! اس حکم کا مخاطب فقط انسان ہے ۔ علامہ اقبال اسی خطاب کو اپنے الفاظ میں یوں ڈھالتے اور سمجھاتے ہیں :

رنگِ او برکن مثالِ او شوی
در جہان عکسِ مثالِ او شوی[۳۷]

مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بو
مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو[۳۸]

نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودۂ ستودہ ہے :

"تخلقوا باخلاق الله ۔"

"اللہ کے اطوار ، آداب ، اخلاق اپناؤ ۔" اللہ کے رنگ میں رنگے جانا یا اللہ کے اخلاق اپنانا اسی وجود کے لیے ممکن ہے جس میں اس امر سے مطابق اور متناسب اہلیت ہوگی ۔ بنو آدم کے وجود میں یہ امکانات ودیعت شدہ ہیں اور بیان کردہ ہدایت اسی نے دی تھی جس نے یہ اہلیت ودیعت کی تھی ۔ اس سے بڑھ کر تو کیا اس جیسا بھی لطف و خبیر کون ہے ۔ یہ اہلیت جس نے ودیعت کی اسی نے یہ بتا بھی دیا :

فأقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التي فطر الناس عليها ، لاتبديل لخلق الله ذلك الدين القيم و لكن اكثر الناس لايعلمون ۔[۳۹]

"چنانچہ تم یکسر ہوکر دین (اسلام) کی طرف متوجہ رہو ، (رخ اس کی طرف رکھو) اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس کے پیرائے پر انسان کو اللہ نے پیدا کیا ، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ، یہی ہے دین سیدھا اور راست ، لیکن اکثر لوگ یہ بات بھی نہیں جانتے ۔"

اس آیۃ کریمہ میں بڑی اہم بات کہی گئی ہے ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں :

"انسانی فضیلت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اس کی فطرت کو فطرت الٰہی کے مطابق ٹھہرایا ۔"[۵۰]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی فرماتے ہیں :

"فطرت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص میں اللہ تعالیٰ نے خلقۃً یہ استعداد رکھی ہے کہ اگر حق کو سنے تو وہ سمجھ میں آ جاتا ہے اور اس کے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ اس استعداد اور قابلیت سے کام لے اور اس کے مقتضا پر کہ ادراک حق ہے عمل کرے ۔ یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ یہ دین تو عین فطرت انسانی کے مطابق ہے اور فطرت بشری میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ، اس لیے اس دین میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ۔"[۵۱]

پروفیسر عبداللہ یوسف علی کی تشریح بھی یہی ہے۔ مگر زیادہ حوصلہ افزا اور زیادہ دلنشیں ہے :

"As turned out from the creative hand of God man is innocent, pure, true, free, inclined to right and virtue and endowed with true understanding about his own position in the universe and about God's goodness, wisdom and power".[52]

حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صداقت مہاد ہے :

" کل مولود یولد علی الفطرۃ حتی یعرب عنہ لسانہ ، فأبوہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ ۔"[۵۳]

پیدا ہونے والا ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس کی زبان اس کا حال بیان کرنے لگے ، (مراد بولنے کی عمر تک وہ فطرت صحیحہ پر رہتا ہے) پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں ۔

از روئے فطرت انسان پاک صاف ہے ، توحید اس کا فطری ایمان ہے، اس لیے کہ اس میں خدائے احد نے اپنے اوصاف و صفات سے پرتو پذیر ہونے کی

اہلیت ودیعت کر رکھی ہوئی ہے - وہ طبعاً اور فطرتاً خدا کی طرف کھنچتا ہے- صفات الٰہیہ سے پر تو پذیری خدا نخواستہ خدائی کا بندے میں حلول نہیں، لہٰذا اس عقیدے میں شرک کا لطیف سا بھی شائبہ نہیں پایا جاتا - بقول اقبال بات تو یہ ہے کہ :

از زیانِ صد شعاعِ آفتاب
کم نمی گردد متاعِ آفتاب

یہ الگ بات ہے کہ وہ آگے چل کے والدین کے زیر اثر اور قریبی ماحول کی بدولت اصل فطرت سے دور جا پڑے - اگر وہ حسب فطرت تربیت پائے تو لازماً موحد کے طور پر پروان چڑھے ، بالفاظ دیگر توحید پر قرار آدمی کے اپنی فطرت پر برقرار رہنے کی دلیل ہے - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فطرت مسخ نہیں ہوئی اور اگر کوئی شخص گمراہ ہو چکنے کے بعد اور کفر و شرک کو اپنا کیش بنا لینے کے بعد توحید کی طرف لوٹے تو گویا اس نے اپنی اصل فطرت اور طبیعت کی طرف رجوع کر لیا اور حسب بیان علامہ اقبال :

"پھر چونکہ ذات الٰہیہ ہی فی الحقیقت روحانی اساس ہے زندگی کی لہٰذا اللہ کی اطاعت (خود اپنی) فطرت صحیحہ کی اطاعت ہے - اسلام کے نزدیک حیات کی یہ روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے جسے ہم اختلاف و تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ہیں -"[۵۳]

اقتباس بالا میں دو کلمات یعنی "خود اپنی" میں نے اضافہ کیے ہیں حضرت علامہ کا انگریزی جملہ یہ ہے :

"Loyalty to God virtually amounts to man's loyalty to his own ideal nature."

حضرت سید نذیر نیازی سے ترجمہ کرتے وقت "to his own" کے کلمات صرف نظر ہوگئے - اطاعت خداوندی کا معنی واضح ہے - احکام خداوندی کے مطابق کاروبار حیات میں عمل پیرا ہونا ، عبادت سمیت یہی ہے اپنی فطرت کی جانب لوٹنا جس کا معنی ہے خدا کے رنگ میں رنگے جانا (اور دوسرا معنی خود بخود عیاں ہوگیا کہ جو خدا کا نافرمان ہے وہ خود اپنی فطرت کی مخالفت پر کاربند ہے) اور یہ وہی حقیقت ہے جس کا مصدر آدم کے وجود میں اللہ کا اپنی روح پھونکنا ہے - اللہ کی طرف فطری کشش اور ذوق عبادت بھی اسی

عنصر نور کی کارفرمائی ہے - حضرت علامہ کے الفاظ میں :

"Thus you will see that psychologically speaking prayer is instructive in its origin."[55]

آدمی جب بھی کسی پھندے میں محو و مستغرق ہوتا ہے یا اسے زندگی کے اس شعبے میں بحرانی کیفیت سے دو چار ہونا پڑتا ہے ، جو اس کا اپنا فن یا پیشہ ہے تو عقلی ، منطقی ، ادراکی ، فنی، ہنری اور پیشہ ورانہ اور شعبہ جاتی درجات کی بلندی ہی فقط اس کی نگاہوں پر روا نہیں ہوتی - بلکہ وہ ایک وجدانی مرحلہ و فضا میں آ جاتا ہے - آخر یہ ہے کیا ؟ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ اگر آدمی کے اندرون میں کوئی ایسی شےموجود نہیں جو مادی اور حواسی حدود سے بالا اور ماوراء ہے تو بحرانی اور استغراق لمحات میں بے حدود و بے شعور کیوں ہو جاتا ہے ؟ ٹھیک کہا ہے کسی نے کہ ایک جرنیل میں جب وہ دشمن کی بے پہ بے چالوں سے دو چار ہوتا ہے اور جواباً کامل سرعت کے ساتھ فی البدیہہ چالیں چل رہا ہوتا ہے اس کی حسابی ، کتابی ، منطقی دانش سے زیادہ اس کا وجدانی جوہر کارفرما ہوتا ہے - آدمی کی طبیعت میں کوئی ایسی نوری کیفیت پنہاں ہے جو اچانک بیدار ہو کر اسے کسی مافوق الوجود قسم کے معنی میں منتقل کر دیتی ہے کہ خود اسے معلوم نہیں ہوتا ، مگر وہ یقیناً ان لمحات میں خود اپنے وجود سے بالا کوئی وجود ہوتا ہے ، بعد میں آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ فلاں شے اس کے ذہن میں آناً فاناً ، بے غور و تدبر آ کیسے گئی ، فلاں صورت حال یا مفہوم اس پر ارتعاش برق کی سی تیزی کے ساتھ منکشف ہو کیسے گیا ؟ اسی امر کی تشریح کے طور پر اقتباس ذیل درج کیا جاتا ہے :

"All talents of a painter, a poet or of a shoe maker, if it raises its possessor above the common level of knowledge and ability, is a means to communicating with God and discussing, our private affairs with him."[56]

یہ بحرانی لمحہ وجدانی اور قدسی فضا میں لے جا کے آنکھیں ، کان ، زبان، دانش ، غرض ہر حواسی وسیلے کو اصل سر چشمے تک پہنچا دیتا ہے - بقول علامہ اقبال :

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے "

حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی
نہ تیرہ خاک لحد ہے نہ جلوہ گاہ صفات[۵۸]

یہ آوپر کو کھینچنے کی اہلیت اللہ کی ودیعت کردہ ہے ۔ بشرطیکہ ابن آدم جان بوجھ کے نیچے کی جانب جانے یا زمین سے چپکے رہنے پر مصر نہ ہو ۔ اس ضمن میں مظہر الدین صدیقی کے مقالے Iqbal's Concept of Evolution میں مندرج Lloyd Margan کا بیان دلچسپ مؤید ہے :

"Without denying a felt push from the lower level of one's being—a so-called driving, drawing force welling up from below—to me it feels like drawing upwards through activity existent at a higher level than to which I have attained. This sounds like Plato's notion of Deity whom the Greek philosopher concieves as a magnet pulling all beings towards itself."[59]

عباس محمود العقاد لکھتے ہیں :

"معراج من التراب المجبول الی افق الارواح والعقول"۔
"یہ جبلی مٹی کا روحوں اور عقلوں کے آخری کنارے تک ایک عروج سفر ہے ۔"

اور وہ ساتھ ہی حوالہ دیتے ہیں اس آیۃ کریمہ کا :

"یا ایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحاً فملاقیہ ۔"

یہ جبلی مٹی کا روحوں اور عقلوں کے آخری کنارے تک ایک عروجی سفر ہے—اور وہ ساتھ ہی حوالہ دیتے ہیں اس آیہ کریمہ کا "یا ایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحاً فملاقیہ ۔"

"اے انسان تو محنت و مشقت میں جتا رہے گا اور پھر اپنے رب سے جا ملے گا ۔"

عباس محمود العقاد تشریحاً :

"و انہ لملاقیہ لانہ مخلوق علی صورتہ کماجاء فی الحدیث النبوی الشریف ۔ مخلوق صورہ الخالق ۔"

آدم خدا سے جا ملے گا اس لیے وہ خلق ہی خدا کے روپ میں ہوا جیسا کہ حدیث (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آیا ہے کہ آدم مخلوق ہے صورت خالق پر، اور پھر اس حدیث شریف کا مفہوم واضح کرتے ہوئے استاد العقاد لکھتے ہیں کہ اس سے مراد ہے کہ آدم کو خدائے جل و علا کی صفات حسنٰی اور مثل اعلٰی کا روپ دیا گیا۔[۶۰]

لہٰذا فرد بیدار دل خاک میں اسیر ہو کر نہیں رہ جاتا اور نہ کائنات میں، جسے علامہ نے "جلوہ صفات" کہا ہے، گم ہوتا ہے۔ وہ اعلٰی ممکنات کے باعث خاک کی کشش اور قید سے نکل کر اور جہان شرق و غرب کی حدود کو عبور کر کے اپنے روحانی مصدر و منبع کی طرف ارتقاء پذیر رہتا ہے۔

اولاد آدم کے اس طرح اپنے خالق و معبود کی جانب کھنچنے کی حقیقت کو خدائے تعالٰی نے آیۃ ذیل میں یوں بیان کیا ہے:

"و اذ أخذ ربک من بنی آدم من ظهورهم و ذریتهم و أشهد علی أنفسهم الست بربکم قالوا بلٰی شهدنا أن تقولوا یوم القیامة انا کنا عن هذا غافلین أو تقولوا انما أشرک آباؤنا و کنا ذریة من بعدهم افتهلکنا بما فعل المبطلون۔"[۶۱]

(اور اس واقعہ کا ذکر کیجیے) "جب آپ کے پروردگار نے نکالا آولاد آدم کی پشت سے ان کی نسل کو اور انھی کو ان کی جانوں پر گواہ کیا اور کہا کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں، بولے ضرور ہیں ہم گواہی دیتے ہیں۔ یہ اس لیے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس امر سے بے خبر تھے۔ یا یوں کہنے لگو کہ شرک تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے قبل کیا تھا ہم تو ان کے بعد ان کی نسل سے ہوئے تو کیا تو ہمیں ہلاک کر دے گا (اصل) اہل باطل کے کرتوت پر۔"

ان آیات کے حوالے سے پیر غلام وارث لکھتے ہیں:

"ہمارے عناصر ترکیبی کا ایک خاص مقصد کے تحت ترکیب پانا گویا موجد کے ساتھ عہد نامہ باندھنا ہے کہ وہی ہمارا پیدا کرنے والا ہے، یہ عناصر خود بخود بغیر کسی سبب اول کے اس ہیئت کذائی پر مجتمع نہیں ہوگئے۔ جس طرح حروف تہجی خود بخود کتاب

نہیں بن جاتے - گویا ہمارا نفس وجود ہی اپنے موجد پر شاہد ہے - اب کوئی شخص یہ عذر نہیں کر سکتا کہ یا رب ہمیں اجرو عتاب کی کیا خبر تھی کہ شرک یا کفر سے قیامت کے دن ہم پر کیا بیتے گی ، ہم نے اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کی ، کیا یہ انصاف ہے کہ لوگ جو اسیر باطل تھے اور جو قفس عنصری میں بند وجود ذات سے بے خبر تھے انھیں چند روزہ زندگی کی غلط کاریوں کے بدلے ابدی ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے - خدا کی حجت قاطعہ ہے کہ اقرار الست ہر علیحدہ علیحدہ شخص سے لیا گیا ہے یعنی خدا کے رب مطلق ہونے پر ہر کوئی خود برہان ہے پس جو کوئی اپنی کج عقلی کے دخل سے منکر ہوا وہ بھی مورد الزام ہوا ۔"[۶۲]

مطلب یہ کہ روح کے اندر ایک اضطراب کا بپا رہنا قدرتی امر ہے ، اگر اس اضطراب کی لم معلوم ہو جائے تو راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے ورنہ بنو آدم الجھ کر رہ جاتے ہیں - بقول حضرت علامہ اقبال خدا پرستی کا فطری عنصر جب مقصود کو واضح طور پر سمجھ نہیں سکتا تو ذوق عبادت و عبودیت کی تسکین کے لیے غیر اللہ کے آگے جھکنے لگتا ہے بلکہ خود ہی صنم تراشتا ہے اور ان کے سامنے خود ہی سجدہ ریز ہو جاتا ہے - حضرت علامہ کے شعر ذیل میں یہ مفہوم بڑے فنکارانہ انداز میں بیان ہوا ہے :

ذوق حضور در جہان رسم صنم گری نہاد
عشق فریب می دہد جان امیدوار را[۶۳]

بالفاظ دیگر یہ روح کی بھوک ہے جو عبادت میں تسکین ڈھونڈتی ہے - یہ الگ بات ہے کہ اسے حقیقی تسکین اس وقت تک میسر نہیں آتی جب تک وہ معبود حقیقی کی راہ پر نہیں پڑ جاتی تاہم وہ ادھر اُدھر سجدہ ریز ہو کر اپنے آپ کو بہلا لیتی ہے - عباس محمود العقاد مرحوم کہتے ہیں :

"ولنا أن نقول ان الروح تجوع كما يجوع الجسد و ان طلب الروح بطعامها كطلب الجسد بطعامه لايتوقف على جودة الغذاء ولا على حلاوة المذاق بل يتوقف على شعور العزيزة بالحاجة اليه ۔"[۶۴]

"ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روح کو اسی طرح بھوک لگتی ہے جس طرح بدن کو ، اور پھر روح بھی اسی طرح اپنی خوراک کی طالب

رہتی ہے جس طرح جسم اپنی خوراک کا ، یہ امر نہ غذا کی دلاویزی اور خوبصورتی پر منحصر ہے اور نہ حلاوت ذائقہ پر بلکہ یہ مبنی ہے طبیعت کے شعور پر کہ وہ اس غذا کی محتاج ہے ۔"

غذا کیسی ہے یہ مسئلہ بعد کا ہے ، بھوک طبعی تقاضا ہے ، وہ پورا ہونا چاہیے ۔ لہٰذا روح اپنی بھوک مٹانے کے لیے اوپر اوپر بھٹکتی ہے ، غلط اور سراسر باطل عقائد کا سہارا بھی قبول کر لیتی ہے ، بنو آدم کی یہ بے یابی کوئی تازہ واردات نہیں ۔ پیمان الست کا ذکر ابھی اوپر ہو چکا ہے ، لارڈ نارتھ بورن نے آدمی کی اسی اندرونی بھوک پر بالفاظ ذیل روشنی ڈالی ہے۔

"The secret longing of man—hidden some times even from himself—is to serve God, so that when no satisfactory opportunity to do so, however indirectly, comes unsought to him from his environment, when nobody tells him to seek it, but on the contrary every influence urges him to seek something else, his secret longing remains unsatisfied and loses his sense of loyalty and purpose."[65]

یہ روحانی اور نہانی تمنا بدستور کسی شے کی تلاش میں مصروف رہتی ہے ۔ ڈاکٹر حاتم رائے پوری اس کیفیت کو جذبۂ عبودیت کہتے ہیں ۔ وہ جین مت اور بدھ مت والوں کے تذکرے کے دوران میں لکھتے ہیں :

"بدھ مذہب کی طرح جین مذہب بھی محض لا الہ کا قائل ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں عقیدوں کے ماننے والے جذبۂ عبودیت کی نیش زنی سے مجبور ہوکر اپنے بانیین مذہب ہی کو خدا کا مقام دیتے اور ان کی پرستش کرتے ہیں ۔"[۶۶]

حضرت مولانا روم نے یہی بات اپنے انداز میں کہی ۔ یہ شعر آغاز مثنوی کے اشعار میں سے ہے :

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگار وصلِ خویش

صنم پتھر کے ہوں ، دھات کے یا گوشت پوست کے ، قبائلی صنم ہوں یا علاقائی، فکری صنم ہوں یا وہمی ، سب باطل اور ہیچ ، جب تک رخ حریم ذات

کی جانب نہ ہو اور اس راہ میں جد و جہد شروع نہ ہو جائے - فطرت بیتاب باطل سہاروں سے نجات نہیں پا سکتی اور چونکہ ہر باطل سہارا مخلوق ہے- لہٰذا اس پر انحصار کا مطلب ہوا غیر خدا سے قرب اور خدا سے دوری ، علاج اس کا خود شناسی ہے جہاں سے خدا شناسی کی راہ نکلتی ہے ، پھر سارے باطل سہارے اور ہمہ رنگی اصنام بے حقیقت ہوکر رہ جاتے ہیں بقول حضرت علامہ :

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا[۶۷]

خود آگہان کہ ازین خاکدان برون جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند[۶۸]

چسیت دین ، برخاستن از روئے خاک
تازہ خود آگاہ گردد جانِ پاک[۶۹]

جب جہان فانی کی حقیقت سامنے آتی ہے اور ظواہر کا طلسم ٹوٹتا ہے تو جان اپنی پہچان کے قابل ہوتی ہے ، تو پھر پتہ چلتا ہے کہ وہاں فقط "وہی وہ" ہے اور کوئی نہیں - مولانا روم فرماتے ہیں :

باد در مردم ہوا و آرزوست !
چوں ہوا بگذاشتی پیغام ہو است

گویا مولانا روم کی نظروں میں اہل ہوا اسیر ہیں - جب ہوس سے نجات پاتے ہیں تو دل سے پھر وہی آوازۂ ہو برآمد ہوتا ہے -

---

حواشی

۱ - اقبال ریویو، اقبال اکیڈیمی پاکستان، لاہور، جولائی ۱۹۸۴ء ، ص۱۷۰-

۲ - قرآن حکیم ، سورہ ۹۵ ، آیت ۴ -

۳ - کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۱ -

۴ - کلیات اقبال (اردو) ، بال جبریل ، ص ۱۲۹ -

۵ - کلیات اقبال (فارسی)، زبور عجم ، ص ۱۳۶ -

۶ - اقبال ممدوح عالم ، بزم اقبال ، کلب روڈ لاہور ، ص ۱۱۴ ، ۱۱۵ -

۷ - ایضاً ، ص ۱۱۶ ، ۱۱۷ (اور آخری جملہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا ہے) -

۸ - کلیات اقبال (اردو) ، بانگ درا ، ص ۵۵ -

۹ - ایضاً ، ص ۸۱ -

۱۰ - ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، اقبال کا ذہنی ارتقاء ، مکتبہ خیابان ادب ، لاہور ، ص ۳۰ -

۱۱ - کلیات اقبال (اردو) ، بانگ درا ، ص ۱۴۰ -

۱۲ - کلیات اقبال (فارسی) جاوید نامہ ، ص ۱۹۱ -

۱۳ - محمد رفیق افضل ، گفتار اقبال ، ادارہ تحقیقات پاکستان ، دانشگاہ پنجاب ، لاہور ، ص ۲۵۴ -

۱۴ - رفیق افضل ، گفتار اقبال ، ص ۲۴۹ ، ۲۵۰ -

۱۵ - کلیات اقبال ، اسرار خودی ، ص ۱۱ -

۱۶ - مکتوب بنام سید محمد سعید الدین جعفری ، خطوط اقبال ، مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مکتبہ خیابان ، لاہور ، ص ۱۶۵ ، ۱۶۶ -

17. *Reconstruction of Religious Thought in Islam* p. 1.

18. *Reconstruction*, p. 56.

۱۹ - کلیات اقبال (اردو) بال جبریل ، ص ۱۶۶ -

20. *The Problem of Right Conduct*, Longman Green and Co, London, 1957 p. 54.

21. *Reconstruction* p. 116.

۲۲ - کلیات اقبال (فارسی) ارمغان حجاز ، ص ۱۲۲ -

23. *The Making of Humanity*, al Maarif, Ganj Bakhsh Road, Lahore, 1980, p. 368.

۲۴ - کلیات اقبال (اردو) بال جبریل ، ص ۴۹ -

۲۵ - کلیات اقبال (فارسی) جاوید نامہ ، ص ۱۵۴ -

۲۶ - کلیات اقبال (فارسی) زبور عجم ، ص ۱۱۶ -

۲۷ - قرآن حکیم سورہ ۱۵ ، آیت ۲۹ -

28. *The Message of Quran*, p. 386.

۲۹ - ضیاء القرآن ، ص ۵۴۱ -

۳۰ - ایضاً -

۳۱ - حجتہ اللہ البالغہ ، قرآن محل (ترجمہ مولانا عبدالحق)، کراچی ، ص ۴۴ -

۳۲ - کلیات اقبال (فارسی) اسرار خودی ، ص ۱۸ -

۳۳ - ایضاً ، (رموز) ، ص ۸۷ -

۳۴ - کلیات اقبال (فارسی) پیام مشرق ، ص ۷ -

35. *The Holy Quran, Elucidation*, 1768.

۳۶ - کلیات اقبال (اردو) بال جبریل ، ص ۸۴ -

۳۷ - تفسیر ماجدی ، سورہ ۲ ، آیت ۳۰ ، ص ۱۵ -

۳۸ - قرآن حکیم ، سورہ ۲ ، آیت ۳۰ -

۳۹ - قرآن حکیم ، سورہ ۲ ، آیت ۳۱ -

۴۰ - کلیات اقبال (فارسی) ، اسرار و رموز ، ص ۱۴۴ -

۴۱ - قرآن حکیم ، سورہ ۲ ، آیت ۳۳ -

42. *Islam and Man*, University of Mashhad, Iran, pp. 9-10.

۴۳ - تبیان القرآن ، پیر غلام وارث ، ص ۲۱ -

۴۴ - کلیات اقبال (فارسی) زبور عجم ، ص ۱۱۶ -

۴۵ - فکر اقبال ، نفیس اکیڈیمی ، حیدر آباد (دکن) ، ص ۱۷۰ -

۴۶ - قرآن حکیم ، سورہ ۲ آیت ۱۳۸ -

۴۷ - کلیات اقبال (فارسی) رموز ، ص ۱۵۷ -

۴۸ - کلیات اقبال (فارسی) جاوید نامہ ، ص ۷۵ -

۴۹ - قرآن حکیم ، سورہ ۳۰ - آیت ۳۰ -

۵۰ - روح اقبال ، آئینۂ ادب ؛ ص ۱۸۶ -

۵۱ - تفسیر ماجدی ، تاج کمپنی ، لاہور ، ص ۸۲۰ -

52. *The Holy Quran, Elucidation* pp. 35, 41.

۵۳ - فیض القدیر ، محمد حسن ، حنیف اللہ ، مصطفٰی البالی ، قاہرہ ، ص ۲۴۳ ، حصہ دوم -

۵۴ - تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۲۲۷-

۵۵ - ایضاً ، ص ۱۳۵ -

56. Iranian Academy of Philosophy, Tehran p. 82.

۵۷ - کلیات اقبال (اردو) ، بال جبریل ، ص ۳۳ -

۵۸ - کلیات اقبال (اردو) ، ارمغان حجاز ، ص ۲۰ -

59. *Studies in Iqbal's Thought and Art*, Bazm-i-Iqbal, Lahore, p. 148.

۶۰ - قرآن حکیم ، سورہ ۸۰ ، آیت ۶ ، حقایق الاسلام واباطیل خصومہ ، دارالکتاب عربی ، بیروت ص ۱۲۳ - ۱۳۲ -

۶۱ - قرآن حکیم ، سورہ ۷ ، آیت ۱۷۲ و ۱۷۳ -

۶۲ - تبیان القرآن (روح صدق) المستقر ، نیا مزنگ ، لاہور ، ص ۷۱۲ -

۶۳ - کلیات اقبال (فارسی) ، زبور عجم ، ص ۵۱ -

۶۴ - اللہ، طبع دوم ، دارالمعارف ، مصر ، ص ۸ -

65. *Religion in the Modern World*, Sohail Academy, Lahore, p. 16.

۶۶ - تصور بشر اور اقبال کا مرد مومن ، مکتبہ جامع نگر ، دہلی ، ص ۱۶۵ -

۶۷ - کلیات اقبال (اردو) ، بال جبریل ، ص ۲۲ -

۶۸ - کلیات اقبال (فارسی) ، ارمغان حجاز ، ص ۲۶ -

۶۹ - کلیات اقبال (فارسی) ، جاوید نامہ ، ص ۶۲ -

(۱۹۸۵ء)